رضا علی عابدی

دَری

یہ بلکل سچ ہے کہ بڑے بوڑھوں کے مشورے اکثر بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب فاروق روزگار کی تلاش میں شہر جانے لگا اور چودھری رحمت الٰہی کو سلام کرنے پہنچا تو چودھری صاحب نے دعائیں دیتے ہوے اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوے کہا کہ بیٹے، شہر جانا تو ساتھ ایک دری ضرور لیتے جانا۔

فاروق نے وہ دری ہمراہ لے لی جس پر اس کے بڑے بہنوئی کو بجلی کا جھٹکا لگنے کے بعد لٹایا گیا تھا اور اُس نے وہیں دَم توڑا تھا اور جس پر اس کی چھوٹی بہن دلہن بن کر بیٹھی تھی۔

دری کو لَپیٹتے ہوے وہ سوچتا رہا کہ خدا جانے یہ دری نیک ہے یا مَنحوس۔ ایک بار اس نے چاہا کہ دری کو سونگھ لے مگر پھر خیال آیا کہ گھر میں کون سی دس دریاں دھری ہیں کہ اِس کی بو اچّھی نہ ہوئی تو وہ دوسری یا تیسری یا چوتھی دری لے جائے گا اور پھر یہ کہ اسے دری سے غرض ہے، دری کی بو میں کیا رکھا ہے۔

شہر پہنچ کر وہ دن بھر نوکری کی تلاش میں گھومتا رہا۔ شام تک وہ تھک کر نِڈھال ہو چکا تھا اور اسے پیٹ بھرنے کی فکر تھی۔ دری کا خیال اسے اُس وقت آیا جب نیند نے آکر اس کے پپوٹوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ پارک کی بنچ پر دری بچھا تے ہوے اس نے دل ہی دل میں خدا کا اور چودھری رحمت الٰہی کا شکر اَدا کیا۔ پھر جو وہ گھوڑے بیچ کر سویا تو صبح اسے ذرا ذرا سا یاد تھا کہ رات کوئی اس کے نیچے سے دری کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے نیند کی حالت میں اسے ''دری چور'' کہا تھا یا کچھ اسی قسم کی گالی دی تھی۔

دن آتے رہے، جاتے رہے اور ہر جاتا ہوا دن جاتے جاتے مایوسی اور نااُمیدی کی داستان رَقم کرتا رہا، یہاں تک کہ فاروق گھر سے جو تھوڑی سی رَقم لایا تھا اس کے نوٹ ختم ہوگئے اور صرف ٹَھن ٹَھن بولتی ہوئی ریزگاری باقی رہ گئی۔

اُس روز وہ نوکری ڈھونڈنے کہیں نہیں گیا بلکہ وہیں پارک میں بیٹھا یہ سوچتا رہا

که اب کیا سوچے اور کیا نہ سوچے۔ اس کی پُشت پر فٹ پاتھ تھا اور فٹ پاتھ پر وہ شخص صبح ہی سے دری بِچھا کر بیٹھ گیا تھا جس کے پاس ایک پنجرا تھا۔ پنجرے میں ایک پرندہ تھا، سامنے بند لفافوں کی قطار چُنی تھی۔ لوگ اس شخص کو ایک آنہ دیتے تھے۔ وہ پرندے کو ذرا دیر کے لیے پنجرے سے رہا کرتا، پرندہ باہر آکر لفافوں کی قطار پر ایک نگاہ ڈالتا اور ایک لفافہ ذرا سا سَرکا دیتا۔ اس کا مالک انعام کے طور پر پرندے کو بھیگی ہوئی دال کا ایک دانہ دیتا اور سرکا ہوا لفافہ کھول کر اور اندر سے ایک کاغذ نکال کر اِکنّی دینے والے کو اس کی قسمت کا حال پڑھ کر سنا دیتا۔

دن ڈھلے تک جس وقت پرندے کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اس نے لفافہ کھینچنے کے عوض دال کا دانہ کھانے سے انکار کر دیا، اس وقت فاروق کے پیٹ میں بھوک کا درد شروع ہوچکا تھا۔ وہ اٹھا اور فٹ پاتھ پر پہنچ کر جیب سے اکنّی نکالی اور پرندے والے کے ہاتھ پر رکھ دی۔ پرندہ، جس پر اب غنودگی طاری ہو چلی تھی، کچھ اس اَدا سے پنجرے سے باہر نکلا جیسے اپنے مالک پر اور قسمت کا حال جاننے والے پر سو احسان کر رہا ہو۔ اس نے بد دلی سے ایک لفافہ کھینچا اور بے اِعتنائی سے پنجرے میں واپس جا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

قسمت کا حال بتانے والے نے لفافے کے اندر سے پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے پہلا فقرہ پڑھا تھا کہ باقی فقرے فاروق نے خود ہی سنا دیے کیونکہ یہ مضمون وہ صبح سے اب تک دس بارہ دفعہ سن چکا تھا، بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ کاش وہ والا لفافہ نکلتا جس میں لکھا ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمھاری مُراد پوری ہو جائی گی۔

''کیا مراد ہے تمھاری؟'' پرندے کے مالک نے پوچھا۔

''مراد کیا ہونی ہے۔ دس دن سے نوکری ڈھونڈ رہا ہوں، جہاں جاتا ہوں لوگ اِتّا بڑا سا سر ہلا دیتے ہیں۔ حیرت ہے، کہیں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔''

''نہیں ہے؟''

''نا۔ اب اگر خالی ہے تو سُسری اپنی جیب خالی ہے۔''

''ایک پیسہ بھی نہیں ہے؟''

''ہے۔ بس ایک اکنّی ہے۔''

''لاؤ وہ مجھے دو۔ میں تمھیں دھندا بتاتا ہوں۔''

فاروق نے قمیص کی گہری جیب میں دو انگلیاں ڈالیں، تنہا اکنّی ڈھونڈنا بھی بَھلا کوئی مشکل کام تھا۔ اِدھر اکنّی ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوئی اُدھر پرندے کے مالک نے اپنی عقل کا پنجرا کھولا، اس میں سے ذہن کا پرندہ نکلا جس نے سمجھ داری کے قطار در قطار چُنے ہوے لفافوں میں سے ایک ذرا سا سرکایا، پرندے کے مالک نے اسے کھولا اور اس کا مضمون منھ زبانی سنا دیا۔ ''کیوں اِدھر اُدھر وقت بے فضول ضائع کرتے پھر رہے ہو۔ سڑک کے کنارے دری بچھاؤ۔ ایک گتّے پر لکھو کہ یہاں ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال بتایا جاتا ہے۔ اگر قسمت اچّھی ہوئی، اس کی نہیں، تمھاری، تو کما کھاؤگے۔ پڑھے لکھے ہو۔ جو بات بھی بتانا ذرا پوچھنے والے کی آنکھوں میں جھانک کے بتانا۔''

''اچّھا۔''

''اور ایک ضروری بات۔ اِس میری والی سڑک پر نہ بیٹھنا۔ کیا سمجھے؟''

اور فاروق اس کیا سمجھے کا جواب دیے بغیر اٹھ گیا۔

اگلی صبح اس نے لڑکیوں کے اسکول اور دفترِروزگار کے درمیان سڑک کے کنارے دری بچھائی۔ جوتے کے ایک خالی ڈِبّے کا پیندا نکال کر اس پر ہاتھ کی لکیریں دیکھے جانے کا اعلان لکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ گردن اٹھا کر آتے جاتے راہ گیروں کی صورتیں دیکھتا رہا لیکن جب گردن دُکھنے لگی اور یہ طے کرنے میں دشواری ہونے لگی کہ درد اٹھی ہوئی گردن میں زیادہ ہے یا بھوکے پیٹ میں، تو اس نے سر جھکا لیا۔

اب وہ آتے جاتے راہ گیروں کے جوتے دیکھنے لگا۔

جب مردانہ جوتے ختم ہوے اور دفتروں کو جانے والے جاچکے تو زنانہ جوتوں کی باری آئی۔ لڑکیوں کے اسکول کا وقت ہو رہا تھا۔ سیاہ سینڈل، سنہرے سینڈل، سرخ چپّلیں سبز چپّلیں، بند جوتے، کھلے جوتے، ملتانی جوتے، کشمیری سلیپریں، بہاولپوری ڈُھسّے، یہ سب اس کے سامنے سے گزرنے شروع ہوے۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہواکہ وہ جوتے کم اور ان کے اندر پیر زیادہ دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ سانولے پیر، گورے پیر، سانولے پیر لیکن گورے تَلوے، گورے پیر لیکن سرخ ایڑیاں، تَرشے ہوے ناخن، بڑھے ہوے ناخن، نیل پالش سے سَجائے ہوے ناخن۔ کسی کسی پیر میں پڑی ہوئی پازیب، پیر کی انگلیوں میں پڑے ہوے چاندی کے چَھلّے، چھلّوں میں پڑے ہوے چھوٹے چھوٹے گھنگرو، کچھ پیر بالکل صاف اور کچھ پر ہلکے ہلکے بھورے بھورے روئیں۔

وہ گردن جھکائے جھکائے دیکھتا رہا۔ کسی کسی پیر کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ گردن اٹھا کر اوپر بھی دیکھ لے کہ اچّھے پیروں والیوں کے چہرے کیسے ہوتے ہیں مگر اس نے جی کڑا کر کے گردن جھکائے رکھی کیونکہ تین دن سے اس نے شیو نہیں بنوایا تھا۔

لڑکیاں سامنے سے گزرتی گئیں، شاید اسکول لگنے ہی والا تھا کیونکہ اب ان کی چال تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک لڑکی کے اُجلے اُجلے پیروں پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے روپہلی چپّل پہن رکھی تھی، گلابی ناخنوں پر اس نے شاید بے رنگ پالش لگا رکی تھی، ایک پیر میں چاندی کی پازیب تھی اور ایک انگوٹھے میں چھلّا پڑا ہوا تھا، شلوار ذرا سی اونچی تھی اور پیروں کے بھورے بھورے روئیں اچّھے لگ رہے تھے۔

فاروق کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے اسے بھی اسکول پہنچنا ہو اور گھنٹی بجنے میں چند لمحے رہ گئے ہوں۔ اچانک دو چیزیں رُکیں: لڑکی کے قدم اور فاروق کا دل۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ جب لڑکی بیٹھی، فاروق کا دل نہیں بیٹھا۔

اب سامنے لڑکی کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ فاروق کو آواز سنائی دی۔ وہ سمجھا کہ پازیب بج رہی ہے۔ لڑکی کہہ رہی تھی، ’’آپ میری قسمت کا حال بتا سکتے ہیں؟‘‘

فاروق سنبھل کر بیٹھ گیا اور گردن جھکائے جھکائے بولا: ’’ہاں ہاں، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔‘‘

اور پھر وہ لڑکی کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگا، جیسے کوئی اَن پڑھ قانون کی کتابیں دیکھ رہا ہو۔ اچانک اسے پرندے کے مالک کی ہدایت یاد آئی: ’’ذرا پوچھنے والے کی آنکھوں میں جھانک کے بتانا۔‘‘

اس نے گردن اٹھائی اور لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ لڑکی پہلے ہی اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ایک لمحے کو فاروق بھول گیا کہ کون کس کی قسمت کا حال بتانے والا ہے۔ پھر اس نے جَتن کر کے خود کو سنبھالا اور بولا: ’’آپ کو … آپ کو محبّت ہے کسی سے؟‘‘

’’ہاں ہاں۔ اور بتائیے۔‘‘

’’مگر اسے محبّت ہے کسی اور سے۔‘‘

’’اور۔‘‘

’’وہ آپ سے بات نہیں کرتا۔‘‘

''نہیں۔''

''آپ کے خطوں کا جواب نہیں دیتا۔''

''نہیں۔''

''آپ نے اس کی سالگرہ کا کارڈ بھیجا تھا۔''

''ہاں۔''

''اس نے صرف تھینک یو کہہ کر فون بند کردیا۔''

''ہاں ہاں۔ اور بتائیے۔ مگر جلدی کیجیے۔ اسکول کی گھنٹی بجنے والی ہے۔''

''اس عِلم میں سر دُکھنے لگتا ہے۔ باقی کل بتاؤں گا۔''

''وعدہ کیجیے۔''

''کیا۔''

''کل، اسی جگہ، میں ذرا پہلے آجاؤں گی تا کہ ...''

''ہاں۔ وعدہ رہا۔''

لڑکی نے اٹھنے سے پہلے جلدی جلدی اپنا بٹوا کھولا۔ فاروق نے سر دوبارہ جھکا لیا تھا۔ اس نے بٹوے سے نوٹ نکلنے کی آواز سنی۔ وہ حیران تھا کہ اتنی ذرا سی محنت کی کتنی اجرت ہونی چاہیے۔ اسے یقین تھا کہ ایک روپے کا نوٹ ہوگا۔ اس نے خوشی خوشی لے کرمُٹّھی میں دبا لیا۔

لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ اب فاروق کو خیال آیا کہ اس نے قسمت کا حال ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر نہیں، لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر بتایا تھا۔ لکیر تو اسے ایک بھی یاد نہ تھی البتّہ سیاہ آنکھیں آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے باوجود بولے جا رہی تھیں۔ کیسے دست شناس ہو؟ یہ سوچ کر فاروق نادم ہوا ہی چاہتا تھا کہ اسکول کے احاطے کے اندر سے لڑکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کوئی حَمد گا رہی تھیں۔ ساری بے سُری تھیں۔ بس ایک آواز بہت سُریلی تھی۔

اچانک فاروق کو خیال آیا کہ ہاتھ کی لکیروں میں کیا ہوتا ہے، کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے اس نے اپنی بند مُٹّھی کھولی۔ اس کے سوال کا جواب سامنے رکھا تھا۔ جسے وہ ایک کا سمجھ بیٹھا تھا، وہ پانچ روپے کا نوٹ تھا۔

اس نے دری لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائی اور حَجّام کی دکان کی طرف لپکا جہاں

گرم غسل کا بندوبست بھی تھا۔ وہ نہاتے نہاتے گُنگُنانے لگا۔ غسل خانے میں خدا جانے کہاں سے اتنی بہت سی بھاپ بھر گئی۔ جیسے بادلوں میں سے کبھی کبھی آسمان نظر آتا ہے، اسے دیوار پر پڑی ہوئی اپنی دری نظر آئی۔ وہی چھوٹی سی دری جو چودھری رحمت الٰہی نے کہا تھا کہ ضرور لے جانا۔

فاروق نے گنگناتے گنگناتے دری کھینچی اور اسے سونگھنے لگا۔ بھاپ سے بھرے ہوے غسل خانے میں اس دری سے بالکل وہی خوشبو آرہی تھی جو دلہنوں میں سے آتی ہے۔